دعوت و تحریک

چند دعوتی تجربے

امام حسن البنا شہیدؒ

ترجمہ: سید حامد علی

ذیل میں ''اخوان المسلمین'' کے بانی و قائد حسن البنا شہید کی ڈائری سے' جو مذاکرات حسن البنا کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے' ان کے چند دعوتی تجربے نقل کیے جا رہے ہیں' جو دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

دین کی دعوت و سربلندی کا کام کس طرح ہو' اور افکار و اعتقادات کے اختلاف کے باعث مسلمانوں میں جو پھوٹ پڑ گئی ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کی کیا صورت ہو؟ میں برابر اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہا۔ صورت حال یہ تھی کہ جو شخص بھی اسلام کے متعلق کوئی بات منہ سے نکالتا' ہر فریق کم ازکم یہ جاننا چاہتا کہ وہ اس کے گروہ کا فرد ہے یا اس کے مخالف گروپ کا آدمی ہے۔ جبکہ میرا مطمح نظر یہ تھا کہ سب سے خطاب کیا جائے' ہر ایک سے تعلقات وابستہ کیے جائیں اور اختلاف کو رفع کر کے ملت کی پھر سے شیرازہ بندی کی جائے۔

ایک عرصے کے مسلسل غور و فکر کے بعد میں نے طے کیا کہ ان تمام گروہ بندیوں سے دُور رہ کر کام کا آغاز کیا جائے۔ اس سلسلے میں' میں خصوصیت سے اس نتیجے پر پہنچا کہ شہر کی مسجدوں میں لوگوں سے خطاب کرنا صحیح نہ ہو گا' کیونکہ بدقسمتی سے مسجدیں اختلافات کا اکھاڑا بن گئی ہیں۔ چنانچہ میں نے عزم کر لیا کہ دعوت و تبلیغ کے لیے میں اس طرف رخ کرنے کے بجائے اور کوئی تدبیر اختیار کروں گا --- پھر کیوں نہ قہوہ خانوں میں جمع ہونے والے لوگوں سے دعوت کا آغاز کیا جائے --- ذہن میں اک تجویز آئی اور میں سوچنے لگ گیا۔

قہوہ خانی درس

یہ خیال بار بار دماغ میں آتا اور پکتا رہا' یہاں تک کہ اس نے عمل کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ میں نے اس مقصد کے لیے تین بڑے قہوہ خانے منتخب کیے' جن میں ہزاروں آدمیوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔

ہر ایک قہوہ خانے میں ہر ہفتہ دو بار درس دینے کا اہتمام کیا' اور پوری پابندی کے ساتھ اس درس کو جاری رکھا۔ شروع شروع میں یہ قہوہ خانی درس لوگوں کو بہت عجیب و غریب معلوم ہوا مگر آہستہ آہستہ وہ اس سے مانوس ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوتے گئے۔

درس کے لیے میں نے اک نیا طرز اختیار کیا۔ وہ یہ تھا کہ ان موضوعات کو منتخب کیا گیا' جن پر ان لوگوں سے عمدگی کے ساتھ گفتگو ہو سکتی تھی اور جس میں عام نصیحت ہی کو ملحوظ رکھا جا سکتا تھا۔ یعنی اللہ اور آخرت کی یاد دہانی اور ترغیب و ترہیب۔ میں نے تنقید و تعریض سے پرہیز کیا' اور جن منکرات و سئیات میں یہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں ان پر انھیں زجر و توبیخ اور ملامت نہیں کی 'بلکہ اس بات پر قناعت کی کہ لوگوں کے دل کسی حد تک متاثر ہوں اور بس۔ اس غرض کے لیے میں نے آسان' پُرکشش اور شوق انگیز طرزِ بیان اختیار کیا' نیز کبھی کبھی عوامی زبان کی آمیزش کی' محسوسات' امثال اور حکایات سے کام لیا۔ غرض اس بات کی پوری کوشش کی کہ طرزِ بیان موثر اور جذبات انگیز ہو اور دلوں کو مائل کرنے اور رغبت و شوق کو ابھارنے کا ذریعہ بن سکے۔ اس کے ساتھ اس امر کا بھی خیال رکھا کہ درس طویل اور اکتا دینے والا نہ ہو۔ صرف دس منٹ' یا اگر کبھی طویل ہو گیا تو زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ تک درس رہتا۔ اس اختصار کے باوجود میں نے اس بات کا پورا لحاظ رکھا کہ جس بات کا بیان کرنا مقصود ہو' اس مختصر وقت میں وہ پوری طرح بیان ہو جائے اور سننے والے بخوبی سمجھ جائیں۔ چنانچہ میں آیات و احادیث کا موزوں انتخاب کرتا' پھر خشوع کے ساتھ ان کی تلاوت کرتا' اور اصطلاحی تفسیروں اور فنی شرحوں سے بچ کر اس طرح ان کی توضیح و تشریح کرتا کہ ان کا مجمل مفہوم کھل کر سامنے آ جاتا۔

اس درس کی اسماعیلیہ کے عوام میں شہرت ہو گئی اور جگہ جگہ اس کے چرچے ہونے لگے۔ لوگ قہوہ خانوں میں درس کے منتظر رہتے۔ پھر جن لوگوں نے اس درس کو سنا' خصوصاً وہ سامعین جو پابندی سے آتے رہے' ان پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ وہ غفلت سے چونکے' غور و فکر کی طرف مائل ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کے ذہنوں میں اس طرح کے سوالات ابھرتے گئے کہ اللہ کا حق کیوں کر ادا ہو' دین و ملّت کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جائے اور عذاب سے نجات پانے اور نعمت ابدی حاصل کرنے کے لیے وہ کیا کریں۔ وہ پے در پے اس قسم کے سوالات کرنے لگے' لیکن میں نے شروع شروع میں ان سوالات کے واضح اور قطعی جوابات دینے سے احتراز کیا' اور یہ اس لیے کیا کہ ان میں مزید بیداری پیدا ہو' ان کے دل اور مائل ہوں' اور جو نفوس سرکشی کے عادی رہے ہیں ان میں قبول احکام کی استعداد پیدا ہو جائے۔

عملی تعلیم

ان کی پیاس میرے ان غیر قطعی اور مبہم جوابات سے نہ بجھ سکی ۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اصرار کیا کہ جس راہ پر انھیں چلنا ہے اس کے نشانات سے انھیں ضرور آگاہ کیا جائے ۔ غرض یہ کہ جب ان کا وجدان اسلام کی بنیادوں کے شعور سے جاگ اٹھا' تو ان میں اسلامی احکام کا علم حاصل کرنے کی طلب اور آمادگی پیدا ہوگئی ۔ میں نے اس سلسلے میں انھیں یہ مشورہ دیا کہ وہ ایک خاص مقام منتخب کرلیں' جہاں وہ درس سے قبل یا بعد اسی غرض سے جمع ہوں تاکہ دینی احکام سیکھیں ۔ لوگوں نے اس مشورہ کو قبول کر لیا اور ان کی نظر انتخاب ایک دُور افتادہ خانقاہ پر پڑی جو کچھ مرمت و درستگی کی محتاج تھی ۔

یا اللہ' ان غریبوں کے دل کس قدر پاکیزہ ہیں! یہ کتنی جلد نیکی کی طرف لپکتے اور مسابقت کرتے ہیں جب کہ انھیں کوئی پاکباز اور مخلص داعی مل جاتا ہے ۔ چنانچہ ہمارے بھائی' جن میں راج مزدور بھی تھے' خانقاہ کی مرمت میں ہمہ تن مصروف ہوگئے اور اپنے مقصد کے مطابق اس کی درستی اور مناسب سامان کی فراہمی میں لگ گئے ۔ دو ہی راتیں گزری تھیں کہ ان کی مساعی سے یہ کام بحسن و خوبی انجام پاگیا' اور اس کے بعد خانقاہ میں پہلا اجتماع منعقد ہوا ۔

جمع ہونے والے تمام اشخاص' یا ان کی زیادہ تعداد' زندگی میں پہلی بار نماز پڑھنے کے لیے آمادہ ہوئی تھی ۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ نماز اور وضو وغیرہ عبادات کے طریقے سیکھنے کے محتاج تھے' لیکن اس کے لیے میں نے نہ تو انھیں عبارتوں کی تلقین کی اور نہ نظری طور پر احکام نماز کی تعلیم دی' بلکہ خالص عملی طرزِ تعلیم اختیار کیا ۔ میں ان سب کو سیدھا وضو کے لوٹوں کے پاس لے گیا' ان میں سے ایک گروہ کو بٹھایا اور ان کی صف بنائی' پھر وضو کا ایک ایک عمل کر کے بتاتا اور ان سے کراتا گیا' یہاں تک کہ انھوں نے پورا وضو کر لیا ۔ اس طرح سب لوگ عمدگی کے ساتھ وضو کرنے لگے ۔ پھر انھیں وضو کے روحانی' بدنی اور دنیوی فواید بتائے' اور وضو کے ثواب کے سلسلے میں جو احادیث نبی ؐ سے وارد ہیں انھیں سنا کر ان کے جذبہ شوق کو برانگیختہ کیا ۔ مثلاً نبی ؐ کا یہ فرمان کہ "جو شخص وضو کرتا ہے اور حسن و خوبی کے ساتھ کرتا ہے' اس کا جسم گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ خارج ہو جاتے ہیں ۔"

وضو سے اس طرح فراغت کے بعد میں نے انھیں بتایا کہ نماز میں کیا کیا کیا جاتا ہے' اور ان سے کہا کہ وہ عملاً نماز پڑھ کر مجھے دکھائیں ۔ اس کے ساتھ میں نے انھیں وہ احادیث سنائیں جن میں نماز کے فضائل بیان کیے گئے ہیں' اور ان وعیدوں سے انھیں ڈرایا جو ترکِ نماز کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں ۔

اسی دوران میں ایک ایک کو سورۂ فاتحہ سنا سنا کر یاد کرائی اور جو چھوٹی سورتیں انھیں یاد تھیں ان کا تلفظ صحیح کرایا۔ اس عرصے میں، میں نے نہ تو ان کے سامنے فقہی مسائل کو مسائل کے انداز میں بیان کیا، اور نہ مشکل اور پر پیچ اصطلاحوں کو استعمال کیا۔ بلکہ گفتگو کو ترغیب و ترہیب سے لبریز باتوں تک ہی محدود رکھا۔ چنانچہ ان کے دل احکام کے لیے نرم پڑ گئے، اور دینی تعلیمات ذہنوں میں وضاحت سے جاگزیں ہوگئیں، اور اس طرح تعلیم کا یہ خالص فقہی گوشہ خشک بننے سے محفوظ رہ گیا۔

اس اثنا میں، میں کتاب اللہ کی آیات، رسول کریم ؐ کی احادیث اور سِیَر صالحین کے ذریعہ صحیح عقائد کے پیدا کرنے، پروان چڑھانے اور دلوں میں پیوست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس ضمن میں فلسفیانہ نظریات اور منطقی قیاسات سے کام لینے کے بجائے میں نے لوگوں کو اس کے لیے آمادہ کیا کہ وہ کائنات پر نظر ڈال کر خالقِ کائنات کی عظمت معلوم کریں، اور مخلوقات کے ذریعے اس کی بلند و برتر صفات کی معرفت حاصل کریں۔ اسی طرح آخرت کی یاد دہانی تذکیر و وعظ کے انداز میں کرتا۔ پھر کسی فاسد عقیدے کو اسی وقت ڈھانے کی کوشش کرتا، جب صالح عقیدہ ذہن میں بٹھا چکا ہوتا۔ تعمیر کے بعد ڈھانا کس قدر آسان ہے اور اس سے قبل کس قدر مشکل! یہ ایک دقیق نکتہ ہے جو مصلحین و واعظین کی نظروں سے بالعموم اوجھل ہو جاتا ہے۔

اختلافات کا فتنہ

یہ درس مغرب سے عشا تک ہوتا، جس کے بعد قہوہ خانوں میں درس کے لیے جانا ہوتا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس درس کا عام چرچا ہو گیا اور بہت سے لوگ اس میں شریک ہونے لگے۔ ان شرکا میں وہ اختلاف پسند اور جنگجو عنصر بھی تھا جو پچھلی فتنہ انگیزی میں حصہ لے چکا تھا۔

ایک رات کو میں نے سامعین میں عجیب و غریب روح محسوس کی: افتراق اور جنگ کی روح۔ میں نے دیکھا کہ سامعین ایک دوسرے سے جدا اور مختلف گروہوں کی شکل میں علاحدہ علاحدہ بیٹھے ہیں۔ میں درس شروع بھی نہ کر سکا تھا کہ یکایک مجھ سے سوال ہوا: "مولانا، توسُّل کے مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

جواب میں، میں نے کہا: "میرے بھائی، میرا خیال یہ ہے کہ آپ مجھ سے صرف یہی سوال نہیں کرنا چاہتے، بلکہ یہ بھی پوچھنا چاہتے ہیں کہ اذان کے بعد صلوٰۃ و سلام پڑھنا کیسا ہے؟ جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کی جائے یا نہیں؟ تشہد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے "سیّدنا" کے لفظ کا استعمال صحیح ہے یا نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کا ٹھکانا آخرت میں کہاں ہے؟ قرآن پاک کی تلاوت کا ثواب میت کو پہنچتا ہے یا نہیں؟ صوفیا کے حلقے باعث معصیت ہیں یا ذریعہ تقرب

خداوندی؟ یہ اور انھی جیسے مسائل کے بارے میں بھی آپ دریافت کرنا چاہتے ہیں؟"

غرض میں نے وہ تمام اختلافی مسائل گنا دیے جو پچھلے فتنے اور ان لوگوں کے شدید اختلافات کا اصل سبب تھے۔ مُستفسِر کو میرا یہ جواب بہت عجیب و غریب معلوم ہوا' اور اس نے کہا: "جی ہاں' میں ان سب سوالات کا جواب چاہتا ہوں"۔

میں نے ان سے کہا: "میرے بھائی' میں ایک عام شہری آدمی اور مدرس ہوں' بعض آیات و احادیث اور کتابوں کے مطالعے سے بعض دینی احکام یاد کر لیتا ہوں' اور لوگوں کو تطوعاً سنا دیتا ہوں۔ اس سے زیادہ کا اگر آپ مجھ سے مطالبہ کریں گے تو اس کا پورا کرنا میرے لیے دشوار ہوگا۔ پھر یہ بھی تو سمجھیے کہ جس شخص نے کسی مسئلے میں یہ کہہ دیا کہ "میں نہیں جانتا" اس نے اپنی حد تک فتویٰ دے دیا۔ اس لیے میں جو کچھ کہتا ہوں' اگر آپ کو پسند آئے اور اس میں اپنی بہتری معلوم ہو تو اس کو سنیے' میں آپ کا شکرگزار ہوں گا' اور اگر آپ کو زیادہ تحقیق و تدقیق مطلوب ہے تو دوسرے علما سے جو اختصاص کا مرتبہ رکھتے ہیں' پوچھ لیجیے۔ باقی میرا مبلغ علم تو بس یہی ہے' اور اللہ تعالیٰ نے بھی ہر شخص کو اس کی وسعت کے مطابق ہی مکلّف ٹھہرایا ہے"۔

یہ جواب سن کر سائل کو خاموش ہونا پڑا اور حاضرین یا ان میں سے اکثر اصحاب کو بھی یہ جواب پسند آیا۔ لیکن میں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مزید کہا: "بھائیو' میں خوب جانتا ہوں کہ سوال کرنے والے بھائی اور آپ میں سے اکثر صاحبان کا اس سوال سے منشا کیا تھا۔ درحقیقت آپ یہ جاننا چاہتے تھے کہ درس دینے والا یہ نیا شخص کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ اس بات کے جان لینے سے آپ کو کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ آپ لوگ کامل آٹھ سال اختلافات اور فتنہ و فساد کی نذر کر چکے ہیں' کیا اتنی مدت اس جیسے کام کے لیے کافی نہیں ہے جو آپ مزید ان مسائل میں الجھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کی وجہ سے مسلمان صدہا سال سے اختلاف و عناد کا شکار رہے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ کو ہمارا اتحاد اور باہمی محبت محبوب ہے اور تفرقہ و اختلاف ناپسند و مبغوض۔ تو کیا میں امید کروں کہ آپ سب صاحبان میرے سامنے متفقہ طور پر اللہ سے یہ عہد و پیمان کریں گے کہ آج سے آپ ان جھگڑوں میں حصہ نہ لیں گے' بلکہ اس بات کی کوشش کریں گے کہ دین کے اصول و مبادی کا علم حاصل کریں' دین کے عمومی اخلاق و اعمال اختیار کریں' اس کے تکلف و تعمق کو چھوڑ دیں' یہاں تک کہ دل صاف ہو جائیں اور لوگوں میں یہ وصف پیدا ہو جائے کہ وہ حق کو معلوم کرنے کے درپے ہوں' نہ کہ کسی خاص خیال کی پچ کے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو ہم ان تمام معاملات پر محبت' اعتماد' اتحاد اور خلوص کے ساتھ باہم تبادلہ خیال کر سکیں گے"۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہم درس سے یہی عہد و پیمان کر کے اٹھے کہ ہم دینِ حنیف پر عمل پیرا ہونے اور اس کی خدمت کرنے میں متفق و متحد رہیں گے، اور اختلافی مسائل میں اپنی اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے بحث و مباحثے سے اجتناب کریں گے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کے بعد یہ درس ہمیشہ اختلاف و عناد سے پاک فضا میں جاری رہا۔ اس کے ساتھ میں نے ایک اور تدبیر بھی اختیار کی۔ میں اخوت کے مختلف پہلوؤں کو گفتگو کا موضوع بنانے لگا تاکہ دلوں میں بھائی چارے کا گہرا نقش بیٹھ جائے۔ نیز میں اختلافی مسائل کو بیان کرتا، اور اس بات کی مثالیں دیتا کہ سلف صالح رحمہم اللہ کس طرح اختلافات میں رواداری اور تسامح برتتے تھے۔ اس طرح یہ حقیقت ان کے سامنے آجاتی کہ ان سب لوگوں کو بھی اختلافی امور میں رواداری اور دوسروں کی رایوں کے احترام کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

اس دوران میں، میں گہری نظر سے لوگوں کا اور ان کے طور و طریق کا مطالعہ کرتا رہا، اور یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ اس نئی سوسائٹی میں موثر عوامل کون کون سے ہیں۔ اس مطالعے کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ عوامل چار ہیں: علما، صوفیا، لیڈر، جماعتیں۔

علما

میں نے علما کے ساتھ خلوص اور احترام کا رویہ اختیار کیا، اور اس کا پورا لحاظ رکھا کہ کسی درس یا تقریر میں ان سے آگے بڑھنے کی جرات نہ کروں۔ چنانچہ میرے درس دینے کے دوران میں اگر کوئی عالمِ دین تشریف لے آتے تو اپنی جگہ ان کے لیے خالی کر دیتا اور انھیں آگے بڑھا دیتا، میرے اس طرزِ عمل سے علما متاثر ہوئے اور اس طرح میں ان سے اپنے حق میں کلمۂ خیر پا سکا۔

اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک قدیم طرز کے عالمِ دین مجھے تنگ کرنے کے درپے ہو گئے۔ ان بزرگ نے جامعہ ازہر میں سالہا سال گزارے تھے، اور اب ان کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ بحث و تکرار اور موشگافیاں کریں۔ یہ بزرگ عجیب و غریب مسائل چھیڑتے، ایسے معانی و مطالب بیان کرتے جو قدیم حواشی اور دقیق اور پُرپیچ بحثوں میں پائے جاتے ہیں، اور اس طرح علما، واعظین اور مدرسین کو پریشان کرتے۔ میں ایک روز حضرت ابراہیم ؑ کے واقعات زندگی لوگوں سے بیان کر رہا تھا، کہ ان بزرگ نے مجھ سے پوچھا: ''حضرت ابراہیم ؑ کے والد کا کیا نام ہے؟'' اس پر میں نے مسکرا کر کہا: ''حضرت، مورخین نے کہا ہے کہ ان کا نام تارخ تھا، اور آزر ان کے چچا کا نام تھا، لیکن قرآن مجید کا بیان ہے کہ آزر ان کے باپ کا نام ہے۔ مگر اس بات کے مان لینے سے بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ آزر ان کے چچا کا نام ہو، کیونکہ عربی میں چچا کو باپ بھی کہہ دیا کرتے ہیں''۔

یہ اس سوال کا کافی و شافی جواب تھا، مگر ان حضرت کو یہ گوارا نہ ہوا کہ میدان کو اس آسانی کے

ساتھ ہاتھ سے نکل جانے دیں' چنانچہ انھوں نے ایک اور اعتراض جڑ ہی دیا' فرمایا: "لیکن ان کے باپ کا نام تارخ "ر" کے پیش سے ہے نہ کہ تارخ "ر" کے زیر سے"۔ میں نے جواب میں کہا: "ہو سکتا ہے کہ یہی ہو' یہ لفظ بہرحال غیرعربی ہے' اور اس کا صحیح تلفظ اسی وقت ممکن ہے جب اس زبان میں مہارت ہو' جس کا یہ لفظ ہے' جبکہ میرا مقصود تو صرف موعظت و نصیحت ہے"۔

ان بزرگوار نے صرف اس چھیڑ خانی پر بس نہیں کیا' بلکہ ان کی کوشش یہ رہی کہ ہر روز درس میں یہی رَوِش اختیار کریں۔ اس لاطائل گفتگو کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ عوام اور سامعین بھاگ کھڑے ہوں اور اس بے سود بحث کے لیے ان دونوں "ملاؤں" کو چھوڑ جائیں۔ آخر میں نے ان حضرت کا علاج سوچا' اور وہ یہ تھا کہ میں نے انھیں اپنے گھر بلا کر ان کا اعزاز و اکرام کیا اور اچھی طرح خاطر مدارات کی' اور فقہ اور تصوف کی دو کتابیں ان کی خدمت میں تحفتاً پیش کیں' اور آیندہ کے لیے یقین دلایا کہ جو کتابیں بھی وہ پسند فرمائیں گے' میں ان کو بخوشی نذر کر دوں گا۔

میرے اس طرزِ عمل سے وہ بزرگ بہت خوش ہوئے۔ اس کے بعد وہ پابندی سے درس میں تشریف لاتے رہے' اور پوری توجہ سے میری معروضات کو سننے لگے۔ نیز لوگوں کو اصرار اور الحاح کے ساتھ درس میں شرکت کی دعوت دینے لگے۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا' اللہ کے رسول ؐ نے سچ فرمایا تھا' تھادوا تحابوا' ایک دوسرے کو ہدیہ دو' اس طرح تم میں باہم محبت ہو جائے گی۔ یہ طریقہ ایک مدت تک کامیابی سے چلتا رہا۔

صوفیا

شیوخ کے ساتھ میں اسی طرح پیش آتا جس کا تصوف و سلوک مقتضی تھا۔ جب ہم تنہائی میں بیٹھتے تو ان میں سے ہر ایک کے سامنے مسلمانوں کی زبوں حالی کو کھول کر بیان کرتا اور بتاتا کہ وہ اپنے دین سے ناواقف ہیں' ان کا باہمی شیرازہ بکھر چکا ہے۔ پھر میں انھیں بتاتا کہ مسلمانوں کی چھاؤنیوں پر الحاد اور اخلاقی ابتری کے حملہ آور ہونے کی وجہ سے ان کی دینی حیثیت کتنے عظیم خطرات سے دوچار ہے اور ان کے بہترین علاقوں پر اغیار کے غلبہ و تسلط کی وجہ سے ان کی سیاسی و مادی حالت کس قدر تشویشناک ہے۔ آخر میں' میں ان سے درخواست کرتا کہ وہ اپنے پیروؤں کی فکری اصلاح کریں' ان کی صحیح اسلامی تربیت کریں' اور اسلام کو سربلند کرنے کی جدوجہد کے لیے انھیں منظم و متحد کریں۔

اس ذیل میں شیخ عبدالوہاب دندراوی مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔ وہ بیس یا اکیس سال کے نوجوان تھے اور اس طرح گویا میرے ہم عمر۔ ان میں مجھے صلاح و خیر کے آثار نظر آئے۔ چنانچہ میں نے حسب دستور عام محفل میں ان کا پورا احترام کیا۔ جب یہ مجلس عام ختم ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ میں آپ

سے ایک کمرے میں تنہا ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ جب ہم دونوں کمرے میں پہنچے تو میں نے اپنی ٹوپی اتار کر کرسی پر رکھ دی اور ان کا عمامہ بھی اتار لیا اور اسے ٹوپی کے قریب رکھ دیا۔ میری اس حرکت پر انھیں سخت حیرت ہو رہی تھی۔ میں نے ان سے کہا: "میرے بھائی' میری اس حرکت پر آپ بُرا نہ مانیں۔ میں نے یہ اس لیے کیا کہ جب آپ سے میری گفتگو ہو تو اس عبدالوہاب دندراوی سے ہو جو بس ایک مسلم نوجوان ہے' کیونکہ شیخ عبدالوہاب کو تو ہم وہیں مجلس عام میں چھوڑ آئے ہیں"۔

پھر میں نے ان سے کہا: "میرے بھائی' آپ کی عمر صرف بیس اکیس سال ہے اور آپ ماشاء اللہ شباب' قوت اور شجاعت کا پیکر ہیں۔ کیا آپ کبھی اس بھیڑ کے حالات پر بھی غور و فکر کرتے ہیں جو آپ کے گرد جمع ہو گئی ہے۔ آپ ذکر اور اشعار خوانی میں رات گزار دیتے ہیں اور بس' پھر کچھ نہیں کرتے۔ کیا آپ کو یہ پسند ہے؟ کیا آپ اس حالت پر مطمئن ہیں؟" اس پر شیخ عبدالوہاب دندراوی بولے: "تو میں کیا کروں"۔ میں نے کہا: "تعلیم' تنظیم' نگرانی اور سلف صالح کی سیرت اور مجاہد و سرفروش بزرگوں کی تاریخ کے مطابق ان کی تربیت" ــــ ان ہی نقاط پر ہماری گفتگو دیر تک جاری رہی' جس سے شیخ نے گہرا تاثر قبول کیا اور ہم نے عملی جدوجہد کے لیے باہم عہد و پیمان کیا۔

اکابر اور لیڈر

اسماعیلیہ کے اکابر اور باہر سے آنے والے سرکاری ملازمین دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ لیکن میں یہ روش اختیار نہیں کر سکتا تھا' کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ عام دعوت کا' جو اخوت و محبت کی دعوت ہے' فطری تقاضا یہ ہے کہ میں دونوں کیمپ کے لیڈروں سے ملوں' اور میرا یہ ملنا لوگوں کو بخوبی معلوم ہو۔ چنانچہ جب میں کسی ایک گروہ کے لیڈر کے پاس جاتا تو عمداً دوسرے فریق کے لیڈر کی طرف سے انھیں باور کراتا کہ دوسرے فریق کے لیڈر کے دل میں ان کے لیے جذبہ خیر ہی موجود ہے' اور وہ اچھے انداز میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ نیز میں اس بات پر بھی زور دیتا کہ دونوں شہر کی فلاح و بہبود کے معاملہ میں باہم تعاون کریں کہ یہی اسلامی ہدایات کے عین مطابق ہے۔ اگر میرے سامنے کوئی شخص کسی فریق کے یہاں بیٹھ کر دوسرے فریق کی برائی کرتا تو میں اسے ٹوک دیتا' اور اس سے عرض کرتا کہ "بھائی' خوبی اور بھلائی اسی میں ہے کہ آپ دونوں میں صلح و آشتی پیدا کرنے کا ذریعہ بنیں۔ اس طرح دونوں گروہ مجھ سے محبت اور میرا احترام کرنے لگے۔ یہ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ تھا کہ جب بعد میں "اخوان" کی دعوت اہلِ اسماعیلیہ کے سامنے آئی تو مختلف طبقات نے متفقہ طور پر اس دعوت کو لبیک کہا۔